پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی لسانیاتی خدمات

Philological Contributions of Pandit Brij Mohan Dataturya Kaifi

محمد عثمان بٹ
پرنسپل، گورنمنٹ ہائی سکول الھڑ، پسرور، سیال کوٹ

Abstract:
Pandit Brij Mohan Dataturya Kaifi (December 13, 1866–November 1, 1955) was a neglected philologist of the twentieth century who has written three important books on Urdu philology named *Manshoorat*, *Khamsa-i-Kaifi* and *Kaifiya*. Manshoorat deals with the discussion on Urdu philology, eloquence and rhetoric, Urdu and Lucknau, and Urdu and Punjab.While Khamsa-i-Kaifi reflects the Urdu language in its historical context along with the debates on Hindu-Muslim cultural relationship. Kaifiya covers the debates about the brief history of Urdu language, transcript, morphology, abandoned words and stylistics. Urdu is an Aryan language which came into existence through Hindu-Muslim cultural and social interaction, according to Pandit Kaifi. This article presents the philological contributions of Pandit Kaifi regarding Urdu in context to his philological writings and lectures.

Keywords:
Urdu Philology, Diachronic and Synchronic study, Hindu-Muslim Cultural Relationship, Urdu Transcript, Word Formation, Stylistics, Abandoned

Words, Eloquence, Rhetoric, Delhi, Lucknau, Punjab

تاریخی اعتبار سے زبان کا مطالعہ علمِ زبان کا بنیادی موضوع ہے جو متنی تنقید، ادبی تنقید، تاریخ اور لسانیات کے کثیر شعبہ جاتی معاملات کا احاطہ کرتا ہے۔ وقت کی مختلف تہوں پر زبان کا تاریخی و تقابلی جائزہ علمِ زبان (Philology) کے زمرے میں آتا ہے جب کہ دوسری طرف لسانیات (Linguistics) کا علم ہے جس کا دائرۂ کار علمِ زبان سے کسی قدر وسیع ہوتا ہے کیوں کہ لسانیات میں بیک وقت سائنس اور منطق کے اُصول اور طریقۂ کار پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ کلاسیکل زبانوں کے مطالعہ جات علمِ زبان کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ فرڈی ناں ڈی سوسئیر کے عمومی لسانیات پر دیے گئے لیکچرز زبان کے جن پہلوؤں کا احاطہ کرتے دکھائی دیتے ہیں، اُنھیں زبان کا وقتِ حاضر کے اعتبار سے مطالعہ (Synchronic study) کہتے ہیں جو عام طور پر لسانیات کے تحت کیا جاتا ہے جبکہ فِلولوجی زبان کے تاریخی اعتبار سے مطالعہ (Diachronic study) کا نام ہے جسے علم اللسان یا علمِ زبان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مغرب کی طرح ہندوستان میں بھی لسانیات کی ابتدا علمِ زبان کی شکل میں سامنے آئی یہی وجہ ہے کہ شروع میں تمام تر توجہ زبان کی ابتدا سے متعلق نظریات پیش کرنے کی طرف ہی صَرف ہونے لگی۔ چوں کہ لسانیات کا علم ابھی اِس قدر پختہ نہیں تھا لہٰذا اکثر نظریات میں اُس سائنسی انداز اور جدید منطقی طریقۂ کار کے استعمال میں کمی دیکھنے کو ملتی ہے جو بیسویں صدی کے وسط سے لسانی نظریات کا خاصہ بننا شروع ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوستان میں کئی ماہرینِ علمِ زبان سامنے آئے جنھوں نے اُردو زبان کے کلاسیکل سرمائے کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ اِن میں ایک اہم نام پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ کا ہے جن کی تحریروں اور لیکچرز نے اُردو زبان کے مختلف مباحث کو خود میں سمویا۔ اِس مقالہ میں اُن کی لسانی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اُردو کے نامور شاعر، محقق، افسانہ نگار اور ماہر علمِ زبان، برجموہن دتاتریہ کیفی 13 دسمبر 1866ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی۔ الطاف حسین حالی کی "مسدسِ حالی" کی طرز پر اُنھوں نے "بھارت درپن" کے نام سے مثنوی لکھی جو "مسدسِ کیفی" کے نام سے معروف ہوئی۔ وہ کیفیؔ اپنا تخلص استعمال کرتے تھے۔ نو سال کی عمر سے اُنھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ 1889ء سے 1890ء تک وہ ہفتہ وار اخبار "خیر اندیش" کے ایڈیٹر رہے جو انبالہ شہر سے نکلتا تھا۔ اِسی دوران اُنھوں نے اپنی مثنوی "آئینۂ ہند" تحریر کی۔ اُن کی شاعری میں اخلاقی اور اصلاحی پہلو نمایاں رہے ہیں۔ 1896ء تا 1899ء تک وہ کنور سچیت سنگھ کے سیکریٹری رہے۔ 1918ء سے لے کر 1926ء تک وہ کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سیکریٹری کے طور پر تعینات رہے۔ 1926ء تا 1929ء اُنھوں نے چنئی میں مجسٹریٹ اور کلکٹر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ 1929ء میں لاہور منتقل ہو گئے اور وہاں سے اپنی بیگم کی وفات کے بعد لائل پور (فیصل آباد) چلے گئے۔ 1939ء میں اُنھوں نے "انجمن ترقیِ اُردو" میں شمولیت اختیار کی۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ "افسانچے" کے نام سے 1944ء میں منظرِ عام

پر آیا۔اُنھوں نے دو مثنویاں لکھیں،ایک "آئینۂ ہند" کے نام سے 1890ء میں اور دوسری "بھارت درپن" کے نام سے 1905ء میں سامنے آئی۔اِس کے علاوہ اُنھوں نے چار شاعری کی کتابیں "توزکِ قیصری"(1908ء)،

"خمخانۂ کیفی"(1924ء)،"تمثیلی مشاعرہ"(1939ء) اور "واردات"(1941ء) تخلیق کیں۔"منشورات" کے نام سے اُن کے لیکچرز کا مجموعہ 1934ء میں اور "خمسۂ کیفی" کے عنوان سے دو نظموں اور تین مضامین پر مشتمل مختصر مجموعہ 1939ء میں منظرِ عام پر آیا۔پنڈت کیفی کا "اُردو لسانیات" کے عنوان سے ایک شاہ کار مضمون ایسا ہے جو مذکورہ دونوں مجموعوں میں شامل ہے۔انشاء اللہ خاں انشا کی معروف اُردو قواعد پر مبنی فارسی کتاب "دریائے لطافت" کا اُردو ترجمہ کرنے کا سہرا بھی پنڈت کیفی کے سر ہے۔اُردو زبان کی مختصر تاریخ اور اُس کی انشا اور املا وغیرہ کے متعلق ہر قسم کے ضروری اور اہم امور سے متعلق بحث پر مبنی اُن کی شہرۂ آفاق کتاب "کیفیہ" کے نام سے 1942ء میں مکتبہ معین الادب،لاہور سے شایع ہوئی۔اُنھوں نے یکم نومبر 1955ء کو وفات پائی۔

"کیفیہ" کو پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اٹھارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔کتاب کے نمایاں مباحث میں اُردو زبان کا تاریخی مطالعہ، حروفِ تہجی، الفاظ و مرکبات، اسم، تذکیر و تانیث، حرف، مصدر، فعل، روزمرہ، کہاوت، کلام، اُسلوب، عروض، مطایبات، خط کتابت، اور املا شامل ہیں۔اُنھوں نے اُردو زبان کے آغاز سے متعلق بحث کرنے سے پہلے پانچ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن میں مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے قبل یہاں کی مقامی زبانوں میں عربی اور فارسی الفاظ کی صورت حال، محمود غزنوی کا پنجاب کو غزنی سلطنت سے منسلک کرنا،اُردو زبان کی پیدایش کے وقت ہندوستان میں رائج زبانیں،اُردو کی تشکیل میں جن زبانوں کا کردار اہم رہا،اور اُردو کا پہلا شاعر اور نثر نگار شامل ہیں۔اُردو زبان کا تاریخی تناظر میں کیفی کا خیال ہے کہ پراکرت میں فارسی الفاظ کی موجودگی اُردو کی پیدایش سے بھی پرانی ہے۔ہندوستان میں اسلامی حکومت قایم ہونے سے بہت عرصہ قبل پراکرتوں میں عربی و فارسی الفاظ شامل تھے۔اُردو زبان کے ارتقا میں دہلی کے ساتھ پنجاب کا کردار بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے جس کے ذمہ دار مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی ہیں۔کھڑی بولی میں نکھار مسلمانوں کی ہندوستان آمد کے بعد سے پیدا ہوا۔اُردو زبان کی تنظیم اور تدوین دہلی میں ہوئی اور یہیں سے اِسے ادبی حیثیت حاصل ہوئی۔کیفی امیر خسرو کو اُردو کا پہلا شاعر اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو اُردو کا پہلا نثر نگار قرار دیتے ہیں۔اُردو کی سب سے پرانی غزل اُن کے نزدیک ایک ہندو شاعر کی ملتی ہے جو برہمن تخلص کرتا تھا۔اِس سے پہلے کے دکنی شعرا کو اُنھوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔اُردو زبان دہلی سے دکن اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہوئی۔

مفرد حروف کسی زبان کے رسمِ خط کی بنیادی اکائیاں ہوتی ہیں جن سے آوازوں کی نمایندگی تحریر میں ہوتی ہے۔حروفِ تہجی پنڈت کیفی کے نزدیک "وہ تحریری شکلیں جو حد امکان تک آواز کی پوری نمایندگی کریں اور اُن میں مزید اختصار کی گنجایش نہ ہو۔اِنھی کے مجموعے کو حروفِ تہجی کہتے ہیں۔"[1] کیفی نے اُردو حروفِ تہجی کی تعداد سینتالیس درج کی ہے۔ہمزہ(ء) کو وہ حرف تصور نہیں کرتے بلکہ اعراب کی علامت گردانتے ہیں۔مرکب حروف

(ہائے مخلوط پر مشتمل) کو اُنھوں نے اُردو حروفِ تہجی میں شامل کیا ہے۔ا،واوری کو اُنھوں نے حروفِ علت اور باقی تمام حروف کو حروفِ صحیح قرار دیا ہے۔ٹ،ڈ،ڑ،ق،ع،غ وغیرہ کی آوازوں کو ثقیل آوازیں اور ب، ج،ز،ل،م،ن وغیرہ کی آوازوں کو ملائم آوازیں قرار دیا ہے۔ کیفی کی بیان کردہ اُردو حروفِ تہجی کی تعداد جدید لسانی معیار پر پورا نہیں اترتی جو کہ جدید لسانی بنیادوں کے مطابق چھتیس بنتی ہے۔ ہمزہ کو حروفِ تہجی میں شامل نہ کرنا اور اِس کی

اعراب میں بطور علامت شمولیت بالکل مناسب ہے چوں کہ یہ مفرد حرف کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ دوسری طرف اُنھوں نے مرکب حروف کو اُردو حروفِ تہجی میں شامل کیا ہے جسے شامل کرنا قطعاً مناسب نہیں چوں کہ اِن کی آوازوں میں اختصار کی گنجایش موجود ہوتی ہے۔ اُنھوں نے مفرد حرف ژ کو اُردو حروفِ تہجی میں شامل نہیں کیا اور اِسے شامل نہ کرنے پر کسی استدلال سے کام بھی نہیں لیا۔ مفرد حرف ژ تو باقاعدہ اُردو حروفِ تہجی کا حصہ ہے جو فارسی زبان سے اُردو میں شامل ہوا جس سے اُردو الفاظ ترتیب پاتے ہیں اگرچہ اِن کی تعداد کم ہے۔

اِس ضمن میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ رقم طراز ہیں:

> "یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کیفی نے ایک حرف ژ کو اُردو حروفِ تہجی کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے اور اِس کے شامل نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی ہے۔ حالاں کہ ژ جو کہ فارسی نژاد ہے اُردو کا ایک باقاعدہ حرف ہے۔ اِس سے تشکیل پانے والے الفاظ اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن معیاری اور ادبی اُردو میں اِن کی حیثیت اور قدر و قیمت مسلم ہے۔ مثلاً مژگاں، مژہ، پژمردہ، ژالہ، اژدہا، ژرف، ژولیدہ، ژیاں وغیرہ۔ یہ بات نہایت پریشان کن ہے کہ کیفی نے اِن الفاظ کو نظر انداز کر کے ژ کو اُردو حروفِ تہجی سے کس طرح خارج کر دیا۔"(۲)

کیفی کی بیان کردہ حروفِ علت اور حروفِ صحیح کی تقسیم مناسب ہے جس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ اِس کے علاوہ اُن کی بیان کردہ ثقیل آوازوں اور ملائم آوازوں پر مشتمل آوازوں کی تاثراتی تقسیم جدید صوتیات کے اُصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔ زبان کے لیے الفاظ بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جو حروف کا مرکب ہوتے ہیں۔ اِس حوالے سے کیفی کا خیال ہے کہ "لفظ کے اجزاے ترکیبی حرف ہیں اور زبان کے اجزاے ترکیبی لفظ ہیں۔"(3) اُن کے خیال میں الفاظ بنانے میں علما، ادیب، شاعر اور عام لوگ تمام یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ کسی زبان کے الفاظ، جس معاشرے میں وہ بولی جاتی ہے، اُس کی ثقافت کے امین بھی ہوتے ہیں۔ اُردو زبان کی سب سے نمایاں خاصیت اِس کا تصرفی عمل ہے جس کے ذریعے اُردو نے مختلف الفاظ کو اپنا حصہ بنایا ہے۔ اُردو زبان میں بہت کم ایسے الفاظ ہیں جنھیں اُردو نے بغیر کسی تبدیلی کے قبول کیا، ورنہ ایسے الفاظ جا بجا بکھرے پڑے ہیں جو تصرف کے نتیجہ کے طور پر اپنائے گئے ہیں۔ الفاظ کو اُردو ایا گیا ہے یعنی الفاظ کو اُردو کے مزاج کے مطابق ڈھالنے کے بعد اُردو

زبان کا حصہ بنایا گیا ہے۔ کیفی کے نزدیک "تصرف کا یہ عمل تبدیل سے کم اور تخفیف سے بہت ہوا۔"[4] الفاظ کے متعلق مختلف باتوں کے تناظر میں کیفی نے مترادف کا غیر مترادف ہو جانا، غیر مترادف کا مترادف ہو جانا، ایک لفظ کے کئی معنی، اعراب کے اختلاف سے معنی میں اختلافات، زبان کی تبدیلی سے معنی کا تبدیل ہو جانا، ایک ہی لفظ کے مختلف مقامات پر مختلف معنی، اور یتیم الفاظ جیسے مباحث پر قلم اٹھایا ہے۔

مرادفات یا مترادف الفاظ کے ضمن میں پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

> "متصرفہ زبانوں کے متعلق تو یہ کہنا درست ہوگا کہ اِن میں کوئی لفظ کسی لفظ کا مرادف یعنی ہم معنی نہیں ہوتا کیوں کہ ہر لفظ کا مادہ جدا گانہ ہوتا ہے۔ لیکن غیر متصرفہ مترقی زبانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اِن میں بہت سے الفاظ ہم معنی اِدھر اُدھر سے آجاتے ہیں اور بہت سے ہوتے بھی ہیں جو اپنی اصل جگہ میں قریب المعنی ہوں مگر ہم معنی مستعمل ہوتے ہیں ایسا ہی حال اُردو کا ہے اِس کے باوجود بھی ذوقِ سلیم اِن لفظوں میں مابہ الامتیاز قایم کر دیتا ہے اور ایسے دو کلمے مرادف نہیں رہے، زیادہ سے زیادہ مترادف کہے جاسکتے ہیں۔"[5]

برجموہن دتاتریہ کیفی کے خیال میں زبانوں میں تصرف کا عمل دو قسم کا ہوتا ہے۔ تصرف کی پہلی قسم کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہے جس میں الفاظ کی شکل تبدیل کرنے کے بعد اُسے اپنایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی لفظ فی (Fee) اُردو زبان میں فیس کی شکل میں تبدیل کرنے کا بعد اپنایا گیا اور اِس کا استعمال بھی مفرد کے طور پر کیا گیا نہ کہ جمع کی حیثیت سے۔ تصرف کی دوسری قسم کا تعلق معنی کے ساتھ ہے جس میں الفاظ کو اُس معنی کی بجائے مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو کہ وہ اصل زبان میں رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر "کھٹ راگ" جو سنسکرت میں چھ راگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اُردو زبان میں بکھیڑا / غیر دل چسپ بات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تصرف کے اِسی نظام کو اُنھوں نے تارید (اُردو بنانا / اُردوانا) کہا ہے اور "جس لفظ میں تصرف کیا جائے اُسے مورَّد یعنی اُردو بنایا گیا۔"[٦] کسی زبان کا استعمال ہی دراصل اُسے زندہ رکھتا ہے اور اس میں اختراعات کا عمل اُسے سنوارنے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اِسی عمل سے زبان پر ترقی کے در کھلتے ہیں اور اُس کے الفاظ کا دامن وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ پنڈت کیفی کا خیال زبان میں اختراعات کے عمل کے ضمن میں معقولیت اور آہستگی کا حامل ہے۔ اُن کا یہ خیال زبان کے فطری تقاضوں سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔ قدامت پسندوں کو اِس عمل کی نہ صرف تیزی کھٹکتی ہے بلکہ وہ تو اِس عمل کے سرے سے ہی خلاف ہیں۔ الفاظ کے تصرف و اختراع کے معاملے کے علاوہ فصاحت اور قواعد کا معاملہ بھی روایت سے بغاوت چاہتا ہے اور زبان میں سخت، متشدد اور بے جا پابندیوں کے خلاف آواز اُٹھانے میں پیش پیش ہے جسے صَرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اِس ضمن میں پنڈت کیفی رقم طراز ہیں:

"زبان میں نئے لفظوں اور مرکبوں کا پیدا ہونا اور اُس کے لغات میں داخل ہونا لازم ہے۔ یہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اِس کی اُصولاً مخالفت کرنا آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا ہے۔"(۷)

اُسلوب کے تناظر میں بات کرتے ہوئے اُنھوں نے اُسلوبِ کلام، اُسلوب کے بنیادی اُصول، اُسلوب کے متعلق چند کلمات، اُسلوب کے نئے رجحانات، نظم میں اُسلوب کے رجحانات، اور آزاد اور حالی کا اُسلوب جیسے مباحث پر قلم اٹھایا ہے۔ اُسلوب کا علمِ زبان سے نہایت گہرا رشتہ ہے اور علمِ معانی کے لیے یہ ایک رہنما کا کردار ادا کرتا ہے۔ تخیل اور اُسلوب ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ ایک اگر جسم ہے تو دوسرا روح کی حیثیت رکھتا

ہے۔ اُسلوب کی حیثیت دستخط کی طرح ہوتی ہے جیسے دستخط سب کا اپنا جدا جدا ہوتا ہے بالکل ویسے ہی اُسلوب بھی ہر تخلیق کار کا منفرد ہوتا ہے۔ دستخط یعنی اُسلوب منفرد ہونے کی حد تک تو درست ہے مگر ایسا نہیں کہ سمجھ سے ہی باہر ہو۔ اُسلوب تو تخلیق کار کو قاری سے قریب تر کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اُسلوب کے ضمن میں کیفی کا خیال ہے کہ یہ ایسا ہو جس سے قاری یا سامع کو بات سمجھنے میں آسانی رہے۔ اُسلوب کے بنیادی اُصولوں میں اُنھوں نے فاعل کا متعلقات کے بعد لانا، فقروں کی باہمی ترتیب، حقیقت اصلی کے بعد اضافی فقرے، واقعات کا اُن کے حقیقی تسلسل کے ساتھ بیان، مخاطب کی مناسبت سے دقیق خیالات کا اظہار، قواعد اور ذوقِ سلیم، قواعد اور فن کے قدغن میں اعتدال، اور معنویت کی اہمیت کو شامل کیا ہے۔ اُسلوب کے نئے رجحانات کے ضمن میں اُنھوں نے اُردو نثر کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اُن کے نزدیک "اُردو کے ابتدائی عہد کی نثر تہذیب، اخلاق اور دینیات کا رَدّہ لیے ہوئے تھی۔"(۸) اِس میں اُنھوں نے ملا وجہی کی سب رس، میر امن کی باغ و بہار، نہال چند لاہوری کی مذہبِ عشق، اور رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب کو شامل کیا ہے۔ دوسرے دور کو اُنھوں نے درمیانی دور کہا ہے جس میں اُنھوں نے رتن ناتھ سرشار، مولانا محمد حسین آزاد، اور ماسٹر پیارے لال کی نثر کو شامل کیا ہے۔ تیسرے دور کو اُنھوں نے نئی تحریک کے نام سے یاد کیا ہے جس نے علی گڑھ تحریک کی صورت میں اپنی آنکھ کھولی۔ کیفی کے نزدیک "جب علی گڑھ کی تحریک شروع ہوئی تو اُردو نثر کی تقدیر نے کروٹ بدلی۔"(۹) سرسید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں کی اُردو نثر اُس دور کا اہم کارنامہ تھی جو آج بھی اُردو نثر کا اہم اثاثہ تصور کی جاتی ہے۔ اِسی موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب(10) میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

علمِ عروض کو بھی کیفی نے موضوعِ سخن بنایا ہے جس میں اُنھوں نے شاعری کی تعریف، اصنافِ نظم، مسدس، مثنوی، رباعی، شعر کا وزن، قافیہ، عروضی اوزان کے ضمن میں عروض کی ماہیت، ابتدائی عہد کے عروض، عربی عروض کے بنیادی عروض، عروضیوں میں اُصولی اختلاف، اُردو اور عربی، پنگل کا اتباع، اور عروض کی ناقابلیتیں، اور عروضی قافیہ کے ضمن میں قافیہ کے ارکان، صوت کا اثر ردی پر، ایطا، اختلافِ رائے، اور قاعدہ اور عقلِ سلیم جیسے معاملات پر قلم اٹھایا ہے۔ قدیم عروضیوں کی بنیاد پر اُنھوں نے نظم کی دس اقسام میں فرد، رباعی، غزل، قصیدہ، قطعہ، مثنوی، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد، اور مسمط کو شامل کیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کے نزدیک اہلِ

یورپ کی تحقیق کے مطابق ابتدا میں شعر کا انحصار وزن کی پابندی سے آزاد تھا مگر اِس کی موجودگی ہی شعر میں تاثیر پیدا کرتی ہے۔ جبکہ کیفی کے خیال میں محض وزن ہی نہیں بلکہ ارادتاً وزن کی موجودگی شعر کی پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ یہی حال قافیے کی صورت میں ہے۔ اُن کے نزدیک بے جا نقل سے پرہیز اِس سلسلہ میں لازم ہے۔ عروض کے ضمن میں وہ دیسی اُردو عروض کے حامی نظر آتے ہیں جس کی تشکیل اور تدوین وہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ زبان اور ادب کے حوالے سے اُن کا خیال ہے کہ اِس ضمن میں قاعدہ اور قانون دونوں عقلِ سلیم اور ذوقِ عامہ کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

شاعری کی تعریف کیفی نے اِن الفاظ میں کی ہے:

> "جذبات اور احساساتِ عایدہ کا خاص دلاویز اور مؤثر طریق سے اظہار و استشہاد، قوتِ متخیلہ کا محاکات و استعاراتِ خاصہ کے ذریعے جوش میں لانا اور مناظرِ قدرت و حقائقِ زندگی کا دل کش و مؤثر احضار شاعری ہے۔"(۱۱)

"خمسۂ کیفی" کے عنوان سے پنڈت کیفی کی مختصر کتاب 1939ء میں سامنے آئی جسے انجمن ترقیِ اُردو، دہلی نے شایع کیا۔ اِس کتاب میں اُن کی دو نظمیں اور تین مضامین کم لیکچرز شامل ہیں۔ نظم کے عنوانات میں "ہماری زبان" اور "ترقیِ اُردو" جب کہ "اُردو' ہماری زبان"، "اُردو لسانیات"، اور "ہندو'مسلمانوں کے کلچرل تعلقات" کے عنوان سے علمی، تحقیقی اور لسانی مضامین شامل ہیں جو اُنھوں نے مختلف لیکچرز کے دوران پڑھے۔ اپنی نظم "ہماری زبان"(12) میں کیفی نے اُردو زبان کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کو نہایت خوب صورت انداز سے سمویا ہے۔ اُن کے خیال میں دنیا کی تمام زبانوں سے پیاری زبان ہماری اُردو ہے۔ سائنس ہو یا ادب و فلسفہ، اِس میں ہر وصف موجود ہے۔ مُراری کی بھرن اور مُرلی کے راگ کی دل کشی اِس میں موجود ہے جو ابھی تک جمنا کنارے گونج رہی ہے اور اِسی کا دودھ پی کر یہ پلی بڑھی ہے۔ پانڈوں کی راج دھانی میں یہ سیانی ہوئی ہے۔ اُردو سے بڑھ کر اور کوئی آریائی زبان نہیں۔ اِس کے شرف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اِسے کئی زبانوں سے ربط و التفات رہا ہے۔ مختلف لسانی گروہوں کو اِس نے جوڑا ہے اور یہ قومی یگانگی کی علامت ہے۔ اُردو زبان ہندو مسلم ملاپ کی ایک اہم یادگار ہے جس میں دونوں کی محنت شامل ہے۔ اِس کی تاریخ صدیوں پرانی ہے اور یہ مختلف اقوام کے اتحاد کا آئینہ ہے۔ ہندوستانی کلچر میں اختلاط کی سب سے بڑی پہچان اُردو ہے۔ اِس کی بدولت رواداری کے کلچر کو فروغ ملا جس کی بنا پر شیخ اور برہمن ایک دوسرے کے قریب آئے۔ یہ تاریخ ہند کی سرتاج اور اتحاد و اُنس کی معراج ہے۔ اِس نے ہندوستانی سماج میں کئی یادگاروں کے نقش چھوڑے۔ کسی دوسری زبان سے اِسے کوئی مغائرت نہیں بلکہ اِس کا دامن ہر کسی کے لیے وسعتیں لیے ہوئے ہے۔ ہندوستان کی بہت سی زبانوں سے اِس کا گہرا ناطہ ہے اور یہ کسی زبان کو غیر نہیں سمجھتی۔ ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے اِس نے ہندوستانی، ہندوی، ریختہ، اُردو وغیرہ جیسے مختلف نام اختیار کیے۔ یہ تمام نام ایک ہی زبان کے ہیں اور اگر کوئی اِن میں ناموں کی بنا پر فرق قایم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ فتنہ پرور

ہے۔ تعصّب کی بنا پر اگر کوئی اِس سے گریزاں ہو تو یہ ایسا ہی ہے جیسے صدیوں کی محنت پر پانی پھیر اجائے۔ وطنیت اور اخوت کی شان اِسی کے دَم سے ہے۔ اُردو نے جس انداز سے دوسری زبانوں سے فیض حاصل کیا ہے اِس سے یہ بات واضح ہے کہ اُردو رشک، حسد، بغض اور کینہ جیسے معاملات سے دور رہتی ہے۔ یہ سب کو اپنا سمجھتا ہے اور کسی کے لیے ذرا بیر نہیں رکھتی۔ اُردو نے کبھی کسی سے غیریت نہیں برتی لہٰذا اِس کی مخالفت کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ اُردو کا سب سے بڑا کارنامہ اِس کا اخذ و انجذاب کا عمل ہے جو کہیں تصریف کے ساتھ اور کہیں بنا تصرف کے چلتا رہا ہے۔

"اُردو ہماری زبان"[13] کے تناظر میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کیفی نے تاریخی حوالے سے اُردو کے مختلف ناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ گزشتہ ایک صدی پہلے ہندی کا لفظ جس زبان کے لیے استعمال ہوتا رہا، وہ اُردو زبان ہی ہے۔ کیفی کے نزدیک "ناموں کی گڑبڑ سے استدلال فضول ہے۔ ہندوستانی، ریختہ اور اُردو وغیرہ ایک ہی زبان کے

نام ہیں۔"[14] وہ اُردو کے آغاز کے ضمن میں اِس بات کے قائل ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی حملوں یعنی مسلمانوں کی آمد سے پہلے اُردو کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سے پہلے فارسی زبان کا علم موجود تھا، یہی وجہ ہے کہ اُس دور میں فارسی الفاظ و مرکبات کا استعمال کہیں کہیں ملتا ہے یعنی ہندو فارسی زبان سے آگاہی مسلمانوں کی ہندوستان آمد سے قبل رکھتے تھے۔ اُردو جسے کیفی ہماری زبان قرار دیتے ہیں، اُسے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ سماجی اختلاط کا نتیجہ سمجھتے ہیں جو اُن کے خیال میں ہر طرح کی قید سے آزاد ہے۔ اُردو الفاظ سازی کے تناظر میں یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جس طرح اُردو نے عربی اور فارسی سے استفادہ کیا بالکل ایسے ہی مقامی زبانوں یعنی پراکرتوں اور اپ بھرنشوں سے بھی برابر فائدہ اُٹھایا مگر کہیں بھی اپنے لسانیاتی تصرف کا دامن نہیں چھوڑا۔ اِس ضمن میں کیفی کے خیال میں اُن ماہرین کا کردار بنیادی حیثیت کا حامل ہے جو بیک وقت بیرونی زبانیں یعنی فارسی و عربی اور مقامی زبانیں یعنی پراکرت و اپ بھرنش جانتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

> "جو فارسی اور عربی لفظ نئی زبان میں آسمائے وہ کام ہے زیادہ تر اُن بزرگوں کا جو اُدھر عربی اور فارسی جانتے تھے اور اِدھر پراکرت اور اپ بھرنش سے واقف تھے۔ اُن میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔"[15]

"ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات"[16] کے تناظر میں خیال ظاہر کرتے ہوئے کیفی نے ہندوستان میں ہونے والے تین کلچرل تصادم اور اتصال کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں آریاؤں کی ہندوستان آمد، مسلمانوں کی ہندوستان آمد اور انگریزوں کی ہندوستان آمد کے نتیجہ میں ہونے والا کلچرل اختلاط شامل ہے۔ ہندوستان میں کلچر کی سطح پر پہلا تصادم اُس وقت ہوا جب آریا آج سے کم و بیش ساڑھے تین ہزار سال پہلے ہندوستان آئے۔ دوسرے تصادم کی بنیاد اُس وقت پڑتی ہے جب مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان وارد ہونا شروع ہوئے۔ تیسرا جب انگریز تجارتی غرض سے ہندوستان آنا شروع ہوئے تب سترھویں صدی عیسوی کے آغاز کے

ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی گئی مگر کلچرل سطح پر اِس کی بدولت تصادم کا آغاز اُس وقت ہوا جب انیسویں صدی کے ربع سوم میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے تجارتی پروگرام کو ختم کیا اور ملک گیر پروگرام شروع کر دیے۔ اپنے اِس مضمون میں کیفی نے مسلمانوں کی ہندوستان آمد کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اُس کلچرل ماحول کی عکاسی کی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اختلاط کے نتیجہ میں سامنے آیا۔ آریا ہندوستان آمد سے قبل لگ بھگ ایک ہزار سال ایران میں قیام پذیر رہے۔ مسلمان ہندوستان میں چوں کہ ایرانی کلچر کے ساتھ وارد ہوئے اِس لیے ہندوستانی کلچر کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہوئے اُنھیں کچھ دیر نہ لگی۔ ایرانی کلچر اور ہندوستانی کلچر میں آریا قدرِ مشترک کے طور پر نمایاں رہے۔ اِس نئے کلچر کا اظہار زبان و ادب پر بھی بھرپور انداز سے ہوا۔ کیفی کے نزدیک "اِس کلچرل ہم آہنگی میں جو حصہ ہماری ورنیکلر یعنی دیسی زبانوں اور ادب کا ہے اُسے بھلایا نہیں جا سکتا۔"[17] پنڈت کیفی ہندو مسلم کلچرل اتحاد کے بہت بڑے داعی تھے اور اِس مقصد کے لیے وہ اُردو زبان کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے چوں کہ وہ اُردو کو ایک ایسے کلچر کی علامت سمجھتے تھے جو ہند ایرانی یعنی ہندو مسلم کلچرل اتحاد کی سب

سے بڑی نشانی تھا۔ مگر جب سیاسی، مذہبی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے یہ اتحاد برقرار نہ رہ سکا جس کی ابتدا زبان، کلچر اور ادب میں ہوئی تھی تو تقسیم نتیجتاً ہندوستان کی عوام کا مقدر ٹھہرنا ہی تھی۔ ہندوستان میں تقسیم کے بعد ابھی تک زبان و ادب میں اُس مشترکہ کلچر کے داعی موجود ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو یقیناً بطور اقلیت اِس کام کو لاشعوری انداز سے نبھاتے چلے آرہے ہیں جب کہ دوسری طرف اکثر ہندو ادیبوں میں اُردو اور مشترکہ کلچر ایسی بحث ناپید ہے۔ پاکستان میں اُردو زبان اور مشترکہ کلچر جس کی بحث تقسیم سے پہلے اگرچہ موجود تھی مگر تقسیم کے بعد مسلمانوں کی اکثریت میں اِس کی ضرورت اپنی سابقہ حالت میں محسوس نہیں کی گئی چوں کہ اِس نے یہاں اپنا رُخ مختلف مادری زبانیں بولنے والی اکائیوں میں اتحاد اور قومیت ایسے جذبات کو اُبھارنے کے لیے بحیثیت قومی زبان اور قومی کلچر، کی جانب کر رکھا ہے۔

"ترقیٔ اُردو"[18] کے عنوان سے کیفی نے ایک نظم تخلیق کی جس میں اُنھوں نے گیارہ مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ اِن میں آثارِ زمانہ، کل اور کل، قدامت، جدّت اوّلیں، تجدیدِ قدیم، مولویت اور تصرفاتِ زبان، زمانہ بدل رہا ہے، زبان کا فعلِ منصبی، تغیرات سابق دلیل تجدید، عہدِ حاضر میں تغیرِ لابد، اور لایحۂ عمل شامل ہیں۔ کیفی کے خیال میں زمانے کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اُس کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے ورنہ زمانہ بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ وہ زبان و ادب میں بھی اِسی تغیر و تبدل کے قائل ہیں مگر شعوری طور پر ارتقائی عمل کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے مزاحمت کے خلاف ہیں۔ وہ جدت کے رنگ کے بنا کسی بھی شے کو تسلیم کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اُنھوں نے ماضی سے زیادہ حال اور مستقبل کی فکر کرنے کی طرف زور دیا ہے۔ اُردو کی ادبی تاریخ کے تناظر میں اُن کا خیال ہے کہ قدما جو کارنامے سرانجام دے گئے ہیں اُردو والوں کو اُن پر فخر ضرور کرنا چاہیے مگر اِس کے ساتھ ہی ساتھ جدت اور وقت کی ضرورت اور تقاضوں کو

بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔اُردو زبان کی ترقی کا راز اِسی میں مضمر ہے کہ اِس کو تغیر و تبدل کی راہ سے آشنا رکھا جائے۔

اُردو ادب اور علمِ زبان کے اہم موضوعات پر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کے علمی، ادبی، تحقیقی اور لسانیاتی لیکچرز کا مجموعہ "منشورات" کے نام سے پہلی دفعہ 1934ء میں لاہور سے منظرِ عام پر آیا جو اُن کے بارہ لیکچرز اور مضامین پر مشتمل ہے۔اِن میں اُردو لسانیات، مبادیات فصاحت، اُردو کی موجودہ ضروریات، تذکیر و تانیث، تشبیہ، متروکات، گل گلاب، اُردو اور لکھنؤ، نظر اور خود نظری، شمس العلما حضرت آزاد مرحوم، نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ، اور اُردو اور پنجاب شامل ہیں۔"منشورات" میں اُردو زبان سے متعلق بعض ایسے پہلوؤں کو بھی بحث کا موضوع بنایا گیا ہے جو اِس سے قبل "کیفیہ" میں زیرِ بحث آ چکے ہیں مگر اب کی بار اُنھیں بھرپور صراحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔پنڈت کیفی کی تصانیف "کیفیہ" اور "منشورات" کا تقابل کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

> "منشورات بھی اگرچہ اُردو زبان کے مسائل سے متعلق ہے، لیکن بعض پہلوؤں سے اِس کا دائرۂ عمل وسیع تر ہے۔ بے شک اِس میں بہت سے ایسے موضوعات پر گفتگو ملتی ہے، جو کیفیہ میں محلِ بحث و نظر ہیں لیکن یہاں اِن سے متعلق نسبتاً تفصیلی اور سیر حاصل اظہارِ خیال ہے۔ کیفیہ میں بڑی حد تک صرف اُصول بیان ہوئے ہیں؛ اِس کے مقابلے میں منشورات میں وضاحت اور شرح مدِّ نظر رہی ہے ۔ اگر مجھے تشبیہ مستعار لینے کی اجازت ہو، تو اِسے یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ کیفیہ نصّ ہے اور منشورات اِس کی تفسیر۔"(19)

پنڈت کیفی کے شاگرد تاجور سامری اپنے استاد کی اُردو زبان کے حوالے سے تینوں کاوشوں "کیفیہ"، "منشورات" اور "خمسۂ کیفی" کا موازنہ کرتے ہوئے اول الذکر تصنیف کو مؤخر الذکر دونوں علمی، ادبی اور لسانیاتی مضامین کم لیکچرز کے مجموعوں پر فوقیت دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں "منشورات" اور "خمسۂ کیفی" چوں کہ تعلیمی اداروں کے طالب علموں کے لیے ترتیب دیے گئے علمی و تحقیقی مقالات پر مبنی لیکچرز ہیں لہٰذا اِن میں طبع زاد عناصر کی "کیفیہ" کی نسبت کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔اِس ضمن میں تاجور سامری کی رائے ملاحظہ ہو:

> "منشوارت۔ خمسۂ کیفی اُن کے تحقیقی اور علمی مقالوں کے مجموعے ہیں۔ یہ بھی بعض تعلیمی اداروں کے لیے بطور لیکچر تحریر کیے گئے۔ اُن مقالوں میں بیش تر ایسے ہیں جیسے کسی کالج کے طالب علموں کے لیے بطور اسباق لکھے گئے ہوں۔ کوئی طبع زاد اَدا اُن میں سے کسی میں نہیں جھلکتی۔ لیکن ایک بات ضرور ہے، اُن کے بیان میں منطق کا جو روپ ہے اگر وہ اور نکھرتا، اُن کی توجہ کا دائرہ ذرا پھیل کر کچھ سیاسی اور سماجی قدروں اور موضوع کا احاطہ کر لیتا تو اُن کی جگہ کہیں اور ہوتی۔ کیفیہ اُن کی کارنامہ تصنیف ہے اور

اور یجنل تحقیق معلوم ہوتی ہے۔ اِس میں اُردو زبان کے گرامر، تاریخ، محاورے اور دوسرے اہم پہلوؤں پر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں بھی جدلیاتی طریقہ اختیار کیا گیا ہوتا تو کتاب کی شان بھی اور ہوتی۔ بہر حال اِس میں اختراع اور ایجاد کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ اُنھوں نے بہت سے نقطے وضع کیے، جیسے 'کل' جو آنے والے اور گزرے ہوئے کے لیے یکساں استعمال ہوتا تھا۔ 'اکل' آنے والے کل کے لیے وضع کیا۔ بے شمار ایسے الفاظ اُنھوں نے گھڑے۔ کچھ چلے بھی۔ جیسے سیّاس بمعنی سیاست دان اور اُڑناؤ بجائے ہوئی جہاز کے۔ وہ طباع تو ضرور تھے مگر اُن کی طباعی کو ماحول مناسب نہ ملا کہ زیادہ نکھرتی اور ترقی پاتی۔"[20]

"اُردو لسانیات"[21] کے تناظر میں بات کرتے ہوئے کیفی کا خیال ہے کہ زبان سے متعلق ہر امر کو سائنسی قرار دے کر اُسے ضابطوں کی قید میں جکڑ نہیں دینا چاہیے بلکہ اِسے اختراعات اور تصرفات بعد از اخذ کے حوالے بھی کرنا چاہیے۔ زبان کے افعالِ ترکیبی کے ضمن میں وہ دو افعال کی بنیادی اہمیت پر زور دیتے ہیں جن میں ایک تو زبان کی اختراعی یا ابداعی صلاحیت اور دوسرا اِس کی اخذ کرنے کی قابلیت ہے۔ زبان پر سائنسی ہونے کی اِس قدر سختی نہ ہو کہ اِن دونوں افعال میں سے کوئی ایک دب جائے بلکہ دونوں کو پروان چڑھنے کے یکساں مواقع ملنے ضروری ہیں۔ اِن میں سے کسی کو دبانا مکمل طور پر غیر فطری اور مصنوعی عمل ہے۔ کیفی کی اِس بات سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہنا جائز ہے کہ زبان سے متعلق اُصول و ضوابط کی قید کا دائرۂ کار اُسی حد تک قابلِ قبول ہے کہ جس حد تک یہ فطری ارتقا کے عمل میں کسی رکاوٹ کا باعث نہ بنے۔ اُن کی رائے میں "جب کوئی زبان اختراع و اخذ کے بارے میں قوت فعل سے عاری ہو جاتی ہے تو ارتقا کی شاہراہ سے بھٹک جاتی ہے۔"[22] کیفی کی رائے اُردو زبان کے لسانیاتی اُصول سے متعلق سید انشا کے اُس قول پر مبنی ہے جسے گوپی چند نارنگ نے اُردو کی لسانیاتی آزادی کا "میگنا کارٹا" قرار دیا ہے اور خود کیفی اِسے فلسفۂ زبان کا سرتاج کہتے ہیں:

"واضح رہے کہ ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح؛ وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے مطابق ہو تو بھی صحیح ہے؛ اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اِس کی صحت اور غلطی اُردو میں اُس کے استعمال پر منحصر ہے کیوں کہ جو اُردو کے خلاف ہے، غلط ہے خواہ وہ اصل زبان میں صحیح ہو اور جو اُردو کے موافق ہے، صحیح ہے خواہ وہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔"[23]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اِس ضمن میں لکھتے ہیں:

"یہ بیان ہر لحاظ سے اُردو زبان کا MAGNA CHARTA کہے جانے کا مستحق ہے۔ اِس لیے کہ اِس میں سب سے پہلے اُردو کی آزادانہ حیثیت منوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیفی کے نظریۂ زبان کا نقطۂ آغاز بھی یہی ہے کہ اُردو نہ فارسی اور عربی کی غلام ہے نہ سنسکرت اور پراکرت کی باندی۔ اِس کے اُصول و قواعد خود اِس زبان کے استعمال اور چلن کی روشنی میں متعین ہونا چاہییں۔"(24)

اُردو زبان میں تصرف کا یہ عمل محض الفاظ کے صوتی استعمال سے متعلق ہی نہیں بلکہ اسم، تذکیر و تانیث اور معنی کے اعتبار سے بھی نبرد آزما دکھائی پڑتا ہے۔ اِس حوالے سے کیفی نے کئی سو الفاظ کا ایک نقشہ مرتب کیا ہے جن میں اسم، فعل اور ضمیر سب شامل ہیں جسے اُنھوں نے چھ مختلف زبانوں (اُردو، ہندی، پنجابی، اپ بھرنش، پراکرت، سنسکرت) میں تقسیم کر کے ہر ایک کے متعلقہ خانے میں مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ مثالیں اہلِ اُردو کے اخذ و تصرف کی بہترین نمایندگی کرتی ہیں۔ پنڈت کیفی کی بیان کردہ مذکورہ مثالوں(25) کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

اُردو	ہندی	پنجابی	اپ بھرنش	پراکرت	سنسکرت
چھانو	چھئیاں	چھاں	چھاؤ	چھا آ	چھایا
بیکا	بانکا	ویںگا	ونکّؤ	وکؤ	وُکرک
ڈھیٹ	ڈھیٹھ	ڈھیٹھ	ڈھٹھو	ڈھٹھو	دھرشٹ
سچ	سانچ	سَچّ	سُچّ	سُچّم	سیتم
کوئل	کویَل	کول	کوئِل	کوئلا	کوکلا
دکھّا	دیکھا	ڈِٹھا	ڈٹھوٗ	ڈِٹھّ	دِرشٹ

کوئی لفظ سنسکرت میں کیسا تھا یہ ضروری نہیں کہ جب وہ اُردو کا حصہ بنے تو بالکل ویسا ہی ہو جیسا کہ سنسکرت میں موجود تھا۔ اگر کوئی لفظ بالکل ویسا ہی جیسا کہ سنسکرت میں پایا جاتا تھا یعنی بنا کسی تبدیلی یا تصرف کے اُردو میں مستعمل ہو تو وہ تتسم الفاظ کے گروہ میں شامل ہو گا۔ اِس کے برعکس اگر کوئی لفظ سنسکرت سے اپنی تبدیل شدہ شکل کے ساتھ اُردو کا حصہ بنا ہے تو اُسے تدبھو الفاظ کے گروہ میں شامل کیا جائے گا۔ جہاں تک اُردو میں صرفیوں کا معاملہ ہے تو اُردو میں تتسم صرفیوں جیسے دیش سے اُپ دیش، کا چلن عام نہیں بلکہ تدبھو صرفیوں جیسے مانگے سے بن مانگے، کا چلن معمول کی بات ہے۔ اگر پراکرتوں سے متعلق مناسب علم نہ ہو تو بہت سے اُردو الفاظ کو صحیح طریقہ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیفی کے خیال میں اُردو کی لسانیاتی تاریخ کا مطالعہ اِس ضمن میں نہایت ضروری ہے جس کے لیے وہ سنسکرت کے علاوہ پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کے علم کے ساتھ ساتھ علمِ صوتیات، فصاحت اور ثقل الفاظ ایسے

معاملات کا مطالعہ بھی لازمی گردانتے ہیں۔ اُردو زبان پر الفاظ کے تصرف کے حوالے سے اگر کبھی الفاظ کا حلیہ بگاڑنے کا الزام لگا تو کیفی کی تحریریں اور اُن کے لیکچرز ایسے الزامات کی تردید کرنے میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ اِس ضمن میں ظہور الحسن لکھتے ہیں:

> "پنڈت کیفی کی تصانیف، خطبات اور مختلف تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اُردو کے ڈول اور کینڈے سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو کے خلاف الزامات کی بڑی پر زور تردید کی ہے۔ مثلاً بعض تنگ نظر حضرات کہتے ہیں کہ اُردو والوں نے سنسکرت الفاظ کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ کیفی کا جواب ہے کہ اُردو نے سنسکرت کے الفاظ کو نہیں بگاڑا بلکہ جہاں ایسا فرق ہے وہاں اُردو میں پالی یا پراکرتوں کے عام رجحان کی تقلید کی ہے۔ جو لفظ اُردو میں حلیہ بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ ملک کی دوسری زبانوں یا پراکرتوں سے اُردو میں آئے ہیں، سنسکرت سے براہِ راست نہیں لیے گئے ہیں۔"(26)

زندہ زبان بنیادی طور پر متحرک ہوتی ہیں جو ارتقائی عمل سے مکمل طور پر لبریز ہوتے ہوئے تبدیلیوں کے عمل سے گزرتی رہتی ہیں۔ اپنے ارتقائی مراحل عبور کرتی ہوئی یہ زبانیں جاندار تبدیلیاں نہ صرف محسوس کرتی ہیں بلکہ اِنھیں قبول بھی کرتی ہیں۔ اُردو زبان میں الفاظ کے اخذ و تصرف کا معاملہ نہایت دل چسپ اور اپنی مثال آپ ہے، اِس لحاظ سے اُردو منفرد زبان ہے۔ یہ خصوصیت دنیا کی کسی دوسری زبان میں اِس طرح موجود نہیں جیسا کہ اُردو کا خاصا ہے۔ الفاظ کو مفرد حالت میں تبدیل کر لیا گیا مگر اُس کی مرکب حالت کو بغیر کسی رد و بدل کے ہی استعمال میں لایا گیا۔ اِس ضمن میں سچ، ہتھ (ہاتھ)، پھول اور ناک وغیرہ جیسی بہت سی مثالیں ہمیں اُردو زبان میں ملتی ہیں۔ اُردو زبان و ادب کے متقدمین کا کردار اِس ضمن میں نہایت اہم رہا ہے جس کی طرف کیفی نے اِن الفاظ کی مدد سے اشارہ کیا ہے:

> "اُردو کے متقدمیں نے اِس کی تدوین و تنظیم میں جو مسالہ اُن کے سامنے تھا اُس سے بہترین کام کیا جس کی بدولت زبان کو مستقل قایم بالذات حیثیت حاصل ہو گئی۔ تصرف لسانی کے معنی صرف اپنانا نہیں بلکہ اپنا سا بنا لینا ہیں۔"(27)

اُردو زبان میں اُردوانے کی جو صلاحیت موجود ہے اِسے خاطر خواہ استعمال میں نہیں لایا گیا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک اُردو میں نئے الفاظ و مرکبات وضع کرنے یا اِس میں اختراع لانے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی جس کے باعث پنڈت کیفی اپنے معاصرین سے شکوہ کناں نظر آتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے بزرگوں کی کمائی ہوئی اُردو میں اختراعات کے عمل کو موقوف کر دیا اور آج ہماری اُردو نئے الفاظ و مرکبات کے معاملے میں

تنہائی کا شکار نظر آتی ہے۔ زبان کا تصریفی و اشتقاقی عمل جمود کا شکار ہے جس میں کوئی تحریک نظر نہیں آتی۔ اُن کا خیال اُس دور کے اعتبار سے بالکل درست محسوس ہوتا ہے کہ آخر کب تک متقدمین کی چھوڑی ہوئی دولت پہ ہاتھ صاف کرتے رہیں گے جو ایک دن آخر ختم ہونی ہی ہے اور اِس میں نئی روح اخذ و تصریف کے عمل سے ہی پھونکی جا سکتی ہے جس میں اُردو زبان کا کوئی ثانی نہیں۔ اُردو زبان کے ضمن میں اِس کوتاہی کے ذمہ دار وہ اپنے معاصرین اور متاخرین کو قرار دیتے ہیں جو اُردو زبان کے مالک بن کر اِس کی مخصوص روایت سے ہٹنے کو تیار نہیں۔ یہ روایت ذاتی معاملات و پسند ناپسند پر مبنی ہے جسے اجتماعیت سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اِسی ضمن میں برجوہن دتاتریہ کیفی تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اُردو کے واحد مالک نہیں بلکہ امین ہیں۔ وہ ایک ودیعت امانت ہے جو حفاظت اور ترقی کے لیے ہمیں سونپی گئی۔ وہ ایک جدی جائیداد ہے جس کی ملکیت ہمیں پر ختم ہونے والی نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ماضی سے سبق لے کر اِس کی موجودہ حالت کا صحیح موازنہ کریں اور اِسے ایسا بنا جائیں کہ ہمارے بعد آنے والے ہم کو دعاے مغفرت سے یاد کریں۔ یاد رہے کہ ہم ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک کڑی ہیں۔
>
> اِس سے زیادہ نہیں اِس لیے ہمارا فرض ہے کہ ذاتی پسند اور چاؤ چونپ کو اجتماعی مفاد پر قربان کر دیں۔ ہمارا مطمع نظر مستقبل اور آئندہ ضروریات ہوں نہ کہ ذاتی تشخص اور خود پسندی۔"[28]

علمِ فصاحت کی روایت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اِس کا تعلق معنی کی بجائے الفاظ سے زیادہ ہے۔ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی "مبادیات فصاحت"[29] کے تناظر میں خیال ظاہر کرتے ہیں کہ فصاحت کا تعلق الفاظ کے ساتھ ساتھ معنی سے بھی کسی حد تک ہے۔ اجزاے کلام میں خوب صورتی اور تنظیم فصاحت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ ہر زبان مخصوص سائنسی اُصول وضوابط کی پابند ہوتی ہے جن پر کچھ لوگ پابندی سے عمل پیرا رہنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ کچھ لوگ سرے سے اُصول وضوابط کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اُصول اگر زیادہ ہی سخت ہوں تو ارتقا کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ دوسری طرف اگر سرے سے کسی اُصول کو تسلیم ہی نہ کیا جائے تو بدنظمی پیدا ہوتی ہے۔ کیفی اِس بارے میں متوازن رائے رکھتے ہیں۔ اِسی ضمن میں علمِ فصاحت کلام میں الفاظ کے ساتھ ساتھ معنی کو بھی یکساں حیثیت دے تو معاملہ زیادہ مفید دکھائی دیتا ہے۔ کلام میں فصاحت و بلاغت پھر ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ٹھہرے جس میں پہلے فصاحت اور پھر ساتھ ہی بلاغت بھی۔ تثلیث فصاحت کے نظریے کی رو سے کلام میں فصاحت سے مراد فصاحت کلمہ، فصاحت کلام، اور فصاحت متکلم کی شمولیت ہے۔ فصاحت کلمہ کے لیے ضروری ہے کہ تنافر حروف، غرابت اور مخالفت قیاس لفظی کی عدم موجودگی۔ اُن کے نزدیک "فصاحت، کلام کا وہ وصف ہے جو قاری یا سامع کے ذہن کو منشی یا متکلم کے ذہن کے قریب ترین پہنچا دیتا ہے۔"[30] فصاحت متکلم کا کیفی کے خیال

میں اصل تعلق زبان کی تقریری حالت سے ہے جس میں مکالمہ بھی شامل ہے۔یعنی اِس کا تعلق حروف کی صحیح آوازوں سے ہے جس سے الفاظ کی صحیح آوازوں کا جنم ہو گا اور اِس کا خاتمہ الفاظ کے درست تلفظ پر ہو گا۔

اُردو ایک متنوع اور جامع حیثیات زبان ہے جس نے جذب و انجذاب کے عمل سے گزر کر اپنے آپ کو نکھارا ہے اور اِس نے ترقی کے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔برجموہن دتاتریہ کیفی "اُردو کی موجودہ ضروریات"[31] کے تناظر میں بات کرتے ہوئے خیال ظاہر کرتے ہیں کہ زبان کی ترقی کے لیے دو عناصر کی اہمیت ناگزیر ہے۔پہلا عنصر الفاظ و کلمات کا وافر ذخیرہ اور دوسرا اِس ذخیرے کی تنظیم یعنی انشا سے متعلق ہے۔اُردو زبان نے عربی و فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں سے بھی استفادہ کیا ہے جسے پنڈت کیفی اُردو زبان کے اجزاے ترکیبی کہتے ہیں۔الفاظ و کلمات کے وافر ذخیرے سے متعلق اُن کا خیال ہے کہ اُردو میں تصرف کی بے پناہ صلاحیت ہونے کے باوجود اُردو زبان کے اِس پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔متقدمین نے الفاظ کا جو ذخیرہ ہمارے لیے چھوڑا ہم نے اُسی پر قناعت اختیار کر لی اور اِس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ضرورت کی بنا پر دوسری زبانوں کے الفاظ ہر زبان کا حصہ بنتے رہتے ہیں مگر بلاضرورت یہ کام زبان کے لیے مناسب نہیں۔کچھ ایسا ہی معاملہ کسی زبان میں مستعار الفاظ کا بھی ٹھہرتا ہے جو اگر بلاضرورت ہو تو اِس سے زبان کی صرفی خصوصیت سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔اِس ضمن میں پنڈت کیفی رقم طراز ہیں:

> "جب کوئی زبان ضرورت صحیحہ کے بغیر دوسری زبانوں کے کلمات اور مرکبات مستعار لینے کی عادی ہو جاتی ہے تو اُس کی صرفی استعداد، اشتقاقی قوت اور اختراعی صلاحیت فنا ہو جاتی ہے اور وہ ادبی ناداری اور دریوزہ گری کی درگت کو پہنچ جاتی ہے۔"[32]

اُردو زبان میں بھی دوسری بہت سی زبانوں کی طرح الفاظ کے حوالے سے مذکر مؤنث کی بحث پائی جاتی ہے۔ایسے الفاظ بھی موجود ہیں جو ایک علاقے میں مذکر تو دوسرے میں مؤنث کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں۔ایسا صرفی اور غیر صرفی دونوں زبانوں میں پایا جاتا ہے۔دنیا کی مختلف زبانوں میں اسم کو جنس کے اعتبار سے "فطری جنس" اور "قواعدی جنس" جیسی دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔جنس کے لحاظ سے اِسم کی یہی تقسیم اُردو زبان میں بھی ہے۔لسانی ہئیت کا معاملہ "فطری جنس" پر مشتمل تقسیم کے ساتھ وابستہ ہے جبکہ دوسری قسم کے ساتھ ایسا معاملہ پیش نہیں آتا۔"تذکیر و تانیث"[33] کے تناظر میں بات کرتے ہوئے برجموہن دتاتریہ کیفی چار اصول پیش کرتے ہیں جو نہایت اہمیت کے حامل ہیں:

> ا۔ایک لفظ جو کسی زبان میں خواہ سنسکرت یا عربی سے ہماری زبان میں داخل ہوا اُس کی جنس اُس کے مترادف یا قریب المعنی لفظ کی جنس کے موافق ہو گی جو پہلے سے ہمیں معلوم ہے۔

۲۔ جن اسموں میں جمالی اوصاف پائے جائیں یا جن کے معنی میں آسودگی کا عنصر ہو اُنھیں مؤنث قرار دیا جائے۔
۳۔ جن اسموں کے معنی رعب، دہشت اور تشدد پر دلالت کریں اُنھیں مذکر جنس دی جائے۔
۴۔ نمبر ۲۔ اور ۳۔ اُن لفظوں پر عائد ہوں جو مختلف فیہ ہوں یا اُردو میں نو وارد ہوں۔ جو لفظ اُردو میں بالاتفاق مذکر یا مؤنث ہیں اُنھیں بالکل نہ چھیڑا جائے۔(34)

متروکات کا مسئلہ اُن کے زمانے میں نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے بہت سے موضوعات کی طرح اُردو زبان میں متروکات(35) کے ضمن میں بھی اُنھوں نے خاصی گفتگو کی ہے جس کی ذیل میں اُنھوں نے ولیؔ سے لے کر بیسویں صدی کے پہلے ربع تک کے تمام شعرا کی شاعری کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اُن کے نزدیک اُردو زبان میں متروکات کا معاملہ شاہ حاتمؔ سے شروع ہوتا ہے جو بعد میں اصلاحِ زبان کی تحریک بن کر نمایاں ہوا۔ اِس حوالے سے میرؔ، سوداؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، مومنؔ، آتشؔ اور ناسخؔ سب نے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ یہ سلسلہ مذکورہ تمام شاعروں کے شاگردوں سے ہوتا ہوا آگے منتقل ہوتا رہا۔ اُن کے خیال میں اُردو میں اکثر متروکہ الفاظ کا معاملہ بنا کسی استدلال اور اُصول کے چلتا رہا ہے۔ کسی لفظ کو متروک قرار دینے کی وجہ کو بیان کرنا تو درکنار اِس ضمن میں سرے سے کوئی بات ہی نہیں ملتی۔ پنڈت کیفی کے خیال میں کسی لفظ یا مرکب کو متروک قرار دینے سے پہلے اِن چار اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہیے:

۱۔ جو لفظ کریہہ الصوت ہو یا ثقیل التلفظ ہو جب کہ اِس کا مترادف موجود ہو۔
۲۔ جس میں بالذات دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر ذم کا پہلو نکلتا ہو۔
۳۔ علاوہ اِن نقائص کے جو غرابت اور مخالفت قیاس لغوی کے تحت میں آتے ہیں ایسے الفاظ اور ترکیبیں جن کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے عربی یا فارسی لغات دیکھنے کی ضرورت پڑے۔ یعنی اُردو کو عربیرانی نہ بنایا جائے۔ (عرب اور ایران کی زبان سے ماخوذ)۔
۴۔ جو الفاظ سلاست، فصاحت اور ترنم کے منافی ہوں اور اُردو کی شخصیت کے قیام میں ہارج ہوں۔(36)

تہذیب و ثقافت اپنے سماج کا بہترین آئینہ ہیں جو زبان اور ادب کی شبیہ سب سے نمایاں طور پر ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ زبان اور ادب کا آپسی تعلق نہایت گہرا ہے جس کا اثر سماج پر مخصوص انداز سے نظر آتا ہے۔ سماج

کا تصور زبان و ادب کے بنا کرنا ممکن نہیں اور یہیں سے افراد کی انفرادی اور اجتماعی سوچ اپنے عمل کے ساتھ آشکار ہو کر تہذیب و ثقافت کے روپ میں ڈھل جاتی ہے۔ جہاں زبان الفاظ و محاورات کے ذریعے خیالات کے اظہار کا سب سے طاقت ور آلہ ہے وہیں ادب انسانی علم اور سماجی تجربات کو اپنے نرالے ڈھنگ سے مخصوص زمانے کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔ "اُردو اور لکھنؤ"[37] کے تناظر میں بات کرتے ہوئے کیفی نے پہلے اُردو زبان پر عمومی انداز سے گفتگو کی اور بعد میں لکھنؤ کی اُردو کے حوالے سے خدمات کو موضوعِ بحث بنایا۔ کیفی کے خیال میں ادبی رجحان پہلے پہل تو فرد کو اپنی طرف کھینچتا ہے، بعد میں اجتماعی رنگ کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اِس ضمن میں تخلیق کار کو اولین حیثیت حاصل ہے جو شاعر یا مصنف کے ذریعے اُس ادبی رجحان کو مخصوص صنف عطا کرتا ہے۔ ادب چوں کہ سماجی اقدار کی عکاسی بھی کرتا ہے لہٰذا یہ کہنا مناسب ہو گا کہ سماج کے ذہن کی عکاسی ادب سے بڑھ کر کہیں اور ہونا محال ہے۔ اخلاق اور معاشرت کے تانے بانے سماج کے اندر پنہاں ہوتے ہیں جس سے سماج کی اجتماعی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے۔ سماج میں اخلاقی اقدار کی بلندی یا پستی کا اظہار ادب میں لامحالہ طور پر ہوتا ہے اور اِس کی بنیاد میں وہ ماحول لازمی طور پر شریکِ عمل ہے جس میں رہتے ہوئے افراد کی فکری نشوونما اور تربیت ہوتی ہے۔ یہیں سے اصلاح کا عمل شروع ہوتا ہے جو سماج کی ہر سطح پر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیفی اِس ضمن میں جب اصلاح تجویز کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

> "ایک جماعت کے شعرا اور مصنف جب اپنے کلام کو ابتذال، رکاکت اور سکافت سے آلودہ کریں تو سمجھنا چاہیے کہ من حیث الجماعت اُن کا نشوونما اور تربیت اُس ماحول میں ہوئے ہیں جہاں اخلاق اور معاشرت تہذیب کے
>
> نہایت ادنیٰ طبقوں میں پابگل تھے۔ اِس لیے معذور ہیں اور اُن کا فعل چشم پوشی کا مستحق لیکن چوں کہ وہ صورِ ذہنیہ جو مختلف حواس کے ذریعہ پیدا ہوئے ہوں، انسان کے شعور اور نفسِ ناطقہ پر شدید اثر ڈالتے ہیں۔ اِس وجہ سے اُن شعرا اور مصنفین کے کلام کے طرزِ اُسلوب اور اندازِ بیان میں اصلاح تجویز کی جاتی ہے۔"[38]

انسان کی جسمانی اور فکری نشوونما جس طرح اُس کی زندگی کے لیے اہمیت رکھتی ہے بالکل اُسی طرح زبان کی زندگی کے لیے بھی اُس کی جسمانی اور فکری نشوونما لازمی ہے۔ یہاں جسمانی نشوونما سے مراد زبان کی ساخت اور اُس کا ڈھانچہ لیا جائے اور زبان کی فکری نشوونما سے مراد زبان سے متعلق ہر طرح کے تصورات لیے جائیں۔ زبان کے لیے جدت اور ارتقا کا عمل اُس کو فرحت اور تازگی بخشتا ہے جس سے اُس کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ مگر زبان کا دامن وسیع کرنے کے چکر میں غیر ضروری طور پر غرابت اور مخالفتِ قیاسِ لغوی کا استعمال انشا کی خوب صورتی کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ یہ قاری کی حس پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ غرابت اور مخالفتِ قیاسِ لغوی دو ایسے نقائص ہیں جو کیفی کے خیال میں انشا کے ساتھ خصوصاً منسلک ہیں۔ ایسا کلمہ جو نہ صرف خود نامانوس ہو بلکہ اُس کا

استعمال بھی نامانوس ہو جبکہ لغت میں اُس کا متبادل لفظ باآسانی دست یاب ہو، علمِ معنی کے اعتبار سے غرابت کے زمرے میں آتا ہے۔ کیفی کے نزدیک غرابت یہ ہے کہ "ایک خیال کے لیے ایک لغت کے موجود ہوتے ہوئے ہم اُسے چھوڑ کر ایک نیا اور نامانوس الاستعمال لفظ یا ترکیب استعمال کریں۔"(39) دوسری طرف اگر ایسا کلمہ کلام میں لایا جائے جو فارسی یا ہندی کے ضوابط کے بر خلاف شامل ہو، مخالفتِ قیاسِ لغوی کہلاتا ہے۔ پنڈت کیفی نے اِس ضمن میں درج ذیل چھ سقائم کا ذکر کیا ہے جو مخالفتِ قیاسِ لغوی میں شامل ہیں:

1۔ زیادت
2۔ کلمہ کو بے موقع استعمال کرنا
3۔ ترکیبِ اضافی یا توصیفی میں ہندی الفاظ کو آپس میں یا فارسی الفاظ کے ساتھ صفت یا موصوف یا مضاف، مضاف الیہ بنانا یا واؤ عاطفہ کے ربط سے معطوف، معطوف علیہ لانا۔
4۔ ہندی یا فارسی الفاظ کو عربی الفاظ کے طور پر بنانا چناں چہ ملّبب بمعنی لباب اور مزیّب بمعنی زیبا
5۔ کسی لفظ کے اصلی اور معروف معنوں سے انحراف کر کے اور معنوں میں استعمال کرنا جیسے مسالا کے بدلہ مواد
6۔ مقامِ مدح میں ایسا لفظ استعمال کرنا جس سے مدح و ذم دونوں پائے جائیں، جیسے مرزا غالبؔ کے اِس شعر میں:

؎ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
(40)

اخبار کا کردار زبان کی ترویج و ترقی میں بنیادی حیثیت کا حامل رہا ہے کیوں کہ کتب بینوں کی نسبت اخبار بینوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ اخبار کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ قاری کی ادبی حس کو بنانے یا بگاڑنے میں برابر حصہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخبار والوں پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ الفاظ و محاورات کا استعمال بر سند درستی کے ساتھ کیا کریں۔ ایسا کرتے ہوئے پنڈت کیفی دلّی اور لکھنؤ کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتے بلکہ اُن کے نزدیک "زبان کی گڑبڑ کے بارے میں کیا ٹکسال اور کیا گھڑ سال، سب برابر حصہ لے رہے ہیں۔ اِس میں دلّی، لکھنؤ یا کہیں کی کوئی خصوصیت نہیں۔"(41) اُردو کو وہ شعوری طور پر سنسکرت زدہ یا عربی زدہ کرنے کے سخت خلاف تھے چوں کہ اُنھوں نے ہمیشہ اُردو زبان کو ہندوستانی سماج میں باہمی اختلاط کی علامت تصور کیا۔ اُردو کی آزادروی کے وہ سچے ترجمان تھے۔ اُن کے نزدیک "اُردو زبان کی ترقی کے لیے جس طرح کیلاش اور بنارس جانے کی

ضرورت نہیں، اِسی طرح قاہرہ اور تہران جانے کی بھی حاجت نہیں۔"[42] اُردو کی پیدایش کے حوالے سے اُنھوں نے دہلی کو اِس کے مولد و منشا کے حوالے سے تسلیم کیا ہے۔ اِس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> "جوں ہی اُردو سے متعلق لکھنؤ کا نام زبان پر آیا کہ دہلی گھر کے پیر یا پروہت کی طرح سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ اِس لیے مناسب ہے کہ اِس مذکور سے پہلے کہ لکھنؤ نے اُردو کی کیا خدمات کیں، اُن پیر جی کو نبٹا دیا جائے۔ کوئی زبان جب ہاتھ پاؤں نکالتی ہے اور اپنے مولد و منشا سے نکل کر ملک کے اطراف و جوانب میں مٹر گشت کرنے لگتی ہے تو پھر وہ اپنے پرانے سرپرستوں اور محافظوں کے قدغن سے بہت کچھ آزاد ہو جاتی ہے۔ اِس پر اُن کی حکومت کا کوڑا صرف اِس قدر رہ جاتا ہے کہ غیر معمولی اور اہم حوادث کے موقع پر اُن سے استفتا کرے۔"[43]

دہلی اور لکھنؤ اُردو کے دو بڑے دبستان کی شکل میں ہمارے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ دہلی کے روز مرہ و محاورہ کی بات ہو تو لکھنؤ والوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں یہی حال اُلٹ صورت حال میں بھی ہے۔ اُردو نے دہلی اور لکھنؤ میں دو مختلف ماحول دیکھے اور اِسی بنا پر اُس نے بیک وقت دو مختلف قسم کے ماحول میں الگ انداز سے ادب کو تخلیق کیا۔ دہلی میں اگر داخلیت کا رجحان نمایاں رہا تو لکھنؤ نے خارجیت کے لیے راہ ہموار کی۔ اہلِ لکھنؤ نے اگر زبان کے ساتھ میناکاری کی تو دہلی والوں نے اپنا سادگی و پرکاری کا رنگ دکھایا۔ دہلی اور اُس کے اطراف میں پیدا ہونے والی زبان نے لکھنؤ کے ماحول میں اپنا بالکل مختلف انداز دکھایا۔ دہلی اور لکھنؤ کی اپنی اپنی جداگانہ علاقائی رنگت نے اپنے اپنے مخصوص ماحول میں اجتماعیت کی نقش و نگاری کی اور دو الگ الگ دبستانوں کے روپ دھار لیے جن کے آگے باقی چھوٹے محسوس ہونے لگے۔ اِسی کش مکش کے تناظر میں پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

> "طرۂ امتیاز تو اُسی کی دستار کی زینت ہو گا جس نے ماں کی گود میں پہلا لفظ جو سُنا وہ اُردو تھا اور پہلا لفظ جو وہ بولا اُردو تھا؛ لیکن یہ طرۂ امتیاز وہیں تک ضوفشانی کر سکتا ہے جہاں تک روز مرہ، بول چال، چند مقامی رسمیات، خصوصی اصطلاحات اور محاورے کا تعلق ہے، تصنیف و تالیف کے کھلے میدان اور حقائق و جذبات کی وسیع دنیا میں اُس کا چراغ جلنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم نے بالغ نظری اور فراخ دلی سے کام نہ لیا اور اِس کے ساتھ ہی کچھ کر کے نہ دکھایا تو ہماری وقعت صرف آثارِ قدیمہ کے دفتر کی گوں رہ جائے گی۔ دلّی اور لکھنؤ کی بڑائی اِسی میں ہے کہ بڑے

بن کر رہیں۔ بڑے کام کر کے دکھائیں اور چھوٹوں کے بڑا بننے میں مدد فرمائیں۔"(44)

"اُردو اور پنجاب"(45) کے تناظر میں بات کرتے ہوئے کیفی نے اپنے مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ زبان سے متعلق عمومی مباحث کا احاطہ کرتا ہے۔ کیفی کے خیال میں الفاظ کا بے محل استعمال ایک ایسا ذہنی نقص ہے جو قوتِ ارادی کے مزاحم کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں تہذیب و تمدن بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جس پر زبان کے اثرات براہِ راست پڑتے ہیں۔ سماجی اقدار، رسم و رواج، قوانین، طرزِ بود و باش، طرزِ تعمیر، عقاید، ادارے، اور ممنوعات، تہذیب و تمدن کے اہم عناصر ہیں جن کی ترویج و ترقی میں زبان کا کردار سب سے اہم ہے۔ کیفی کے نزدیک "ایک جماعت کے خواصِ جمعی اور ایک فرد کے اشعار کا موازنہ اُس کی زبان کی وضع قطع سے کیا جا سکتا ہے۔"(46) دوسرے حصہ میں پنجاب کا اُردو سے تعلق کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پنجابی کی موجودگی کے باوجود پنجاب نے اُردو کی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا اور ایسا کرتے ہوئے کبھی پنجابی سے بے اعتنائی نہیں برتی گئی۔ پنجاب کے ادبا اور شعرا نے اُردو ادب کے فروغ میں اپنا خصوصی حصہ ڈالا۔ اُردو میں پنجاب کا مقامی رنگ بھی اُسی طرح نظر آتا ہے جیسے دوسرے بہت سے مقامی رنگ اُردو کا لازمی حصہ ہیں۔ کیفی کے نزدیک "یہ بدیہی واقعہ ہے کہ پنجاب اُن خطوں میں سے ہے جنھیں اُردو سے خصوصیت ہے۔ اُردو کی ترقی اور توسیع میں پنجاب کا جو مہتم بالشان حصہ ہے، اُس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔"(47) پنجاب نے اُردو کے حوالے سے لکھنؤ کی نسبت دہلی سے بہت کچھ حاصل کیا۔ جہاں تک فن کی بات ہے تو اِس ضمن میں اہلِ زبان یا غیر اہلِ زبان کی بحث خارج از قیاس ہے مگر دوسری طرف اگر بات روزمرہ و محاورہ کی ہو تو اہلِ زبان کا کردار کھل کر سامنے آتا ہے۔ کوئی زبان اُس وقت قومی زبان کا درجہ حاصل کرنے کے سفر پر چل پڑتی ہے جب اُس معاشرے میں عوام کی مجموعی کاوشیں اِس حوالے سے عملی طور پر نظر آئیں۔ اِس ضمن میں پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

> "قوم کی زبان بنانا یعنی اُسے ہر پہلو سے ترقی دینا ایک انسان یا ایک جرگہ کا کام نہیں۔ اِس کے لیے جمہورِ متعلقہ کی مساعی درکار ہیں۔ کام جو کرنا ہے وہ بے اُصول توسیع کا نہیں بلکہ اُس میں زبان کی تہذیب و تدوین بھی شامل
>
> ہے۔ اُس کی علمی استطاعت میں ترقی کے ساتھ اُس کی لطافت اور ترنم کا بھی لحاظ رکھنا ہے۔ الفاظ کے ذخیرہ اور محاسن ادبی کی بھی توقیر لازم ہے اور یہ بھی مدِ نظر رکھنا ہے کہ جو خوبیاں پہلے سے اُردو میں موجود ہیں وہ کہیں زائل نہ ہو جائیں۔ اِس کام میں پنجاب، دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ مل کر ممتاز اور نمایاں حصہ لے سکتا ہے۔ اِس میں انگریزی داں، عربی داں اور سنسکرت داں اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان، سخن سنج اور ناظم و ناثر، علمی

اشغال میں مصروفِ کار اور صاحبِ تخیل، صیرفی اور فلسفی، سخن فہم اور نقاد
و مبصر سب کے شریکِ کار ہونے کی ضرورت ہے۔"(48)

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اُردو زبان کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول اور باہمی اختلاط و اتحاد کا حاصل سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ اِسے ہندوستان میں ایک مشترکہ کلچر کی علامت بھی قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین باہمی رابطہ سب سے پہلے سندھ پھر پنجاب اور اُس کے بعد دہلی میں ہوا جہاں سے ایک مشترکہ کلچر نے جنم لیا جس کی سب سے بڑی نشانی اُردو زبان ہے۔ اُردو زبان کی پیدایش کے بنیادی ذمہ دار بھی مسلمان اور ہندو ہی ہیں اور اِس زبان کی تنظیم میں اِن دونوں قوموں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہ اُردو کی ہند آریائی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُردو کی تصریفی خصوصیت اُن کے خیال میں اُردو زبان کا سب سے بڑا خاصا ہے۔ کیفی نے اُس دور کے تقریباً تمام لسانیاتی مباحث کو اپنے مضامین میں جگہ دی ہے۔ اُن کی لسانیاتی تحقیق کا دائرہ وسیع ہے۔ اُنھوں نے زبان کے بنیادی عمومی مباحث، اُردو زبان کی مختصر تاریخ و ارتقا، اُردو حروفِ تہجی، الفاظ و مرکبات، قواعدِ اُردو سے متعلق مختلف مباحث، اُسلوب کے اُصول و مباحث، علمِ عروض، اُردو املا و رسمِ خط، اُردو کی اُس دور میں ضروریات، نیز اُردو لسانیات کے دیگر مسائل و مباحث پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اُردو املا اور رسمِ خط کے تناظر میں اُن کی خدمات اہمیت کی حامل ہیں مگر اُردو کے مفرد حروف کی تعداد، واؤ معروف کے اوپر الٹا واؤ اور ختمہ کے لیے + کی علامت وغیرہ جیسے اُن کے تصورات سے راقم اختلاف رکھتا ہے۔ اُن کی اُردو زبان سے وابستگی نہایت جذباتی اور محبت سے بھرپور تھی۔ وہ مولوی عبدالحق کے قریبی ساتھی تھے اور اُنھوں نے انجمن ترقی اُردو ہند کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ مولوی عبدالحق کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد کیفی کا شمار اُن شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندوستان میں انجمن ترقی اُردو کو زندہ رکھا۔ بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں کے لسانیاتی معاملات کو اگر کسی نے سمجھنا ہے تو وہ کیفی کی "کیفیہ" اور "منشورات" جیسی دو بلند پایہ کتابوں کے مطالعے سے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اِس کے علاوہ انشا کی "دریائے لطافت" کا اُردو ترجمہ اُن کے نمایاں کارناموں میں شامل ہے۔ اُردو لسانیات میں اُن کا مقام بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور اُردو زبان و ادب میں لسانیاتی معاملات کے ضمن میں جب بھی اِس کی روایت کا تذکرہ آئے گا پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی شخصیت اور اُن کی لسانیاتی خدمات کا ذکر لازم ہو گا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، مکتبہ معین الادب، لاہور، اشاعت دوم، 1950ء، ص62۔

۲۔ مرزا خلیل احمد بیگ، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی، 1989ء، ص98۔

۳۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، محولہ بالا، ص70۔

۴۔ ایضاً، ص80۔

۵۔ ایضاً، ص95۔

۶۔ ایضاً، ص110۔

۷۔ ایضاً، ص118۔

۸۔ ایضاً، ص287۔

۹۔ ایضاً، ص288۔

10۔ سید عبداللہ،سرسید احمد خاں اور اُن کی نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،2006ء

11۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،کیفیہ، محولۂ بالا،ص296۔297۔

12۔ "ہماری زبان" کے عنوان سے پنڈت کیفی کی ایک نظم "ہماری زبان"،انجمن ترقیِ اُردو(ہند)، دہلی میں یکم جولائی1939ء کو شایع ہوئی جو اُن کے مضامین کے مجموعہ "خمسۂ کیفی" میں بھی موجود ہے۔

13۔ "اُردو ہماری زبان" کے عنوان سے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اُردو کانفرنس،یونین ہال، علی گڑھ میں اپنا ایک مقالہ1936ء میں پڑھا جو اُن کے مضامین کے مجموعہ "خمسۂ کیفی" میں شامل ہے۔

14۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،خمسہ کیفی،انجمن ترقیِ اُردو(ہند)، دہلی،1939ء،ص9۔

15۔ ایضاً، ص11۔

16۔ "ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات" کے عنوان سے پنڈت کیفی نے پٹنہ کے کسی جلسہ میں اپنا ایک مضمون(س ن) پڑھا جو اُن کے مضامین کے مجموعہ "خمسۂ کیفی" میں شامل ہے۔

17۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،خمسہ کیفی، محولۂ بالا،ص57۔

18۔ "ترقیٔ اُردو" کے عنوان سے کیفی کی ایک نظم رسالہ "اُردو" میں جنوری1930ء میں شایع ہوئی جو اُن کے مضامین کے مجموعہ "خمسۂ کیفی" میں بھی موجود ہے۔

19۔ مالک رام،پیش لفظ،منشورات از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،مرتبہ گوپی چند نارنگ، انجمن ترقی اُردو،دلّی،1968ء،ص5۔

20۔ تاجور سامری،ایک زندگی۔ایک صدی،انجمن ترقی اُردو، دہلی،1959ء،ص130۔

21۔ "اُردو لسانیات" کے عنوان سے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے جامعہ عثمانیہ،حیدر آباد،دکن میں ایک توسیعی لیکچر1931ء میں دیا جو اُن کے لیکچرز اور مضامین کے مجموعہ "منشورات" میں شامل ہے۔

22۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،منشورات،مرتبہ گوپی چند نارنگ، انجمن ترقی اُردو،دلّی،1968ء،ص4۔

23۔ سید انشاءاللہ خاں انشاؔ،دریائے لطافت،انجمن ترقی اُردو،اورنگ آباد،1916ء،ص241۔
اصل فارسی اقتباس ملاحظہ ہو:

مخفی نماند کہ ہر لفظے کہ در اُردو مشہور شد، عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سریانی یا پنجابی یا پوربی، از روے اصل غلط یا شد یا صحیح، آں لفظ لفظِ اُردو ست۔ اگر موافقِ اصل مستعمل است ہم صحیح، واگر خلافِ اصل است ہم صحیح۔ صحت و غلطیِ آں موقوف بر استعمال پذیر فتن در اُردو ست۔ زیرا کہ ہر چہ خلافِ اُردو است، غلط است، گو در اصل صحیح باشد و ہر چہ موافقِ اُردو ست، صحیح باشد، گو در اصل صحت نہ داشتہ باشد۔

24۔ گوپی چند نارنگ، مقدمہ، منشورات از پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، مرتبہ گوپی چند نارنگ، انجمن ترقی اُردو، دلّی، 1968ء، ص14۔

25۔ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، منشورات، محولۂ بالا، ص9۔

26۔ ظہور الحسن، پنڈت کیفی کے ادبی کارناموں کا تنقیدی جائزہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1964ء، ص218۔

27۔ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، منشورات، محولۂ بالا، ص13۔

28۔ ایضاً، ص22۔

29۔ "مبادیات فصاحت" کے عنوان سے پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی نے کلب، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن میں ایک توسیعی لیکچر 1930ء میں دیا جو اُن کے لیکچرز اور مضامین کے مجموعہ "منشورات" میں شامل ہے۔

30۔ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، منشورات، محولۂ بالا، ص58۔59۔

31۔ "اُردو کی موجودہ ضروریات" کے عنوان سے پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی نے اُردو سبھا، لاہور میں ایک لیکچر 1934ء میں دیا جو اُن کے لیکچرز اور مضامین کے مجموعہ "منشورات" میں شامل ہے۔

32۔ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، منشورات، محولۂ بالا، ص46۔

33۔ "تذکیر و تانیث" کے عنوان سے پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی نے اُردو سبھا، لاہور میں ایک لیکچر 1934ء میں دیا جو اُن کے لیکچرز اور مضامین کے مجموعہ "منشورات" میں شامل ہے۔

34۔ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، منشورات، محولۂ بالا، ص77۔78۔

35۔ "متروکات" کے موضوع پر پنڈت کیفی نے ایک لیکچر 1925ء میں دیا جو اُن کے لیکچرز اور مضامین کے مجموعہ "منشورات" میں شامل ہے۔

36۔ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، منشورات، محولۂ بالا، ص135۔

37۔ "اُردو اور لکھنؤ" کے عنوان سے پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی نے انجمنِ اُردو، لکھنؤ میں ایک لیکچر 1927ء میں دیا جو اُن کے لیکچرز اور مضامین کے مجموعہ

"منشورات" میں شامل ہے۔

38۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،منشورات، محولۂ بالا،ص150۔151۔

39۔ ایضاً،ص155۔

40۔ ایضاً،ص157۔

41۔ ایضاً،ص159۔

42۔ ایضاً،ص156۔

43۔ ایضاً،ص166۔

44۔ ایضاً،ص189۔

45۔ "اُردو اور پنجاب" کے عنوان سے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے انجمن اربابِ علم،لاہو میں ایک لیکچر1923ء میں دیا جو اُن کے لیکچرز اور مضامین کے مجموعہ "منشورات" میں شامل ہے جب کہ حافظ محمود شیرانی کی تصنیف "پنجاب میں اُردو" 1928ء میں سامنے آئی۔

46۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،منشورات، محولۂ بالا،ص239۔

47۔ ایضاً،ص258۔

48۔ ایضاً،ص268۔

مآخذ

الحن، ظہور،پنڈت کیفی کے ادبی کارناموں کا تنقیدی جائزہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،1964ء

انشا،سید انشاءاللہ خاں،دریائے لطافت،انجمن ترقی اُردو،اورنگ آباد،1916ء

بیگ،مرزا خلیل احمد،پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی،1989ء

پنڈت کیفی،برجموہن دتاتریہ،خمسہ کیفی،انجمن ترقی اُردو،دہلی،1939ء

پنڈت کیفی، برجموہن دتاتریہ(مترجم)،دریائے لطافت از انشاء اللہ خاں انشا،انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد،1935ء

پنڈت کیفی،برجموہن دتاتریہ،کیفیہ،مکتبہ معین الادب،لاہور،اشاعت دوم،1950ء

پنڈت کیفی،برجموہن دتاتریہ،منشورات ،مرتبہ گوپی چند نارنگ،انجمن ترقی اُردو،دلّی،1968ء

سامری،تاجور،ایک زندگی، ایک صدی،انجمن ترقی اُردو،دہلی،1959ء

عبداللہ،سید،سرسید احمد خاں اور اُن کی نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،2006ء